

ایسی تیسی قسم کی روزانیاں مرثتے چڑھا کر ردمیں کئے گھس جلتے باہر نکلتے تو کبھی بیساہی کے تھے پر پر شک کا شان بوتا کسجی گلابی گرہیاں کے مژبند کرنے باہر نکلتی۔

کچھ تو ماحول کا ذائقہ کئے رہیا کے سوال کے ذھان فوڑو تھے سو بھی کہ درتوں سے دل میسے کئے اپس میں یوں باتیں کرتے جیسے دشمنوں کے ایجادیہ ہوں۔ پھر سے پر دلخوازی بہتی اور دل سوکھ منظہ کی طرح چڑھ رہتا۔ ویسے بھی میںاٹیے چھرے گئی تھی جاں باتوں کے آھائے میں لوگ ایکدہ سرکو چپھاڑتے تھے پر زندگی کے ہر مشکل مقام پر دلوں کی طرح چڑھ جاتے تھے۔ سارے گھروالے تن تازہ قلندر راجہ قسم کی زندگی بصر کرتے تھے۔ صندوں کی طرح کچھ تاسعے کے منڈے پران کا عتماد نہ تھا۔ کسی کا گمراہ لٹھنے نہیں چاہتے تھے کہ بڑا کرنے یا سوچنے میں بودھت، تند ہی اور ذہنی بوف اخانا پڑھتے ہے اس کے زندہ لوگ اہل تھے نہ قائل۔ نگھر میں کبھی قن پھن دکھنی نہ ایسی باتوں کی سمجھائی گئی کہ دنیا میں ہر رنگ، قماش، ہر فہرست کا اتنی موجود ہے اور بھانست بھانست کا ادمی کے ساتھ گزا رکنا اور اپنے سے مختلف سخت میں دیکھ سکے ہی کا نہ از نہ گہے۔ مینا کے میکے میں سب سے بڑی رہ بکھری یہ تھی کہ بھوٹی ماریاں زندگی کے ایسے بھجی جاتی تھیں۔ کسی نعم کا باذس فل ہو جانے پر یہ لوگ پنچ اور ٹکیں نہ میں یا درزی قیعنی کی کردا یا تو کارکی جگہ اس نے گول گلابا دیا۔ پھر جب اباجان نے تین دارھیں کمکھیں ٹکوانی تھیں اور کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ یہ برسوں نہ بھرنے والے ایسے تھے۔ عجیب اتفاق ہے لیکن بد قسمتی کا ہاتھ اس گھوپ بہت، ملکا پڑا خا اسی لئے مینا بکھرہ بکھری تھی کہ قسمت کسی کھرانے کے ساتھ سوتیلوں کا سا سکو بھی کیا کر قہے۔ قسمتی کے ول قہے سب اخبار کیا تھیں تھے جن کو پڑھ کر گھری دو گھری سب تتر تک ریا کرتے تھے۔ پھر اس لگدہ لیبرے کے بعد وہی دلائی کی سی گرم زندگی۔

قصور اس نکتہ نظر کا تھا یا پچھلی زندگی کا یا پھر اس کی بھوٹی سی بیاض کا تھا یا سیلیوں کا۔ بہر کیف سارا آنگن ڈیڑھا تھا جس میں اسے نلچنے کئے بغیر کسی تیاری کے بیچھے دیا گیا تھا۔

رات جب اسے جملہ عروضی میں داخل کیا گیا تو پوسے چھ گھنٹے کی تیاری سے اس کی کمریں ہلکا مہکا دد ہو رہا تھا۔ صبح ہر مردوں لیبر کے پاس جو دگھنے کا رکراک بیٹھی رہی سواں گ۔ زیور پہنے کی عادی

نہ تھی پر اس وقت جو چلتا دکھتا زیوراں پر لدا تھا اس کے بوجھ سے اسے عجیب قسم کا سرو رہا۔ اسی پر
رہا تھا۔ کمرے میں اس کے معطر و ہود کے ساتھ ساتھ گلاب اور موستے کے چکروں نے روزہ رہے۔ پس کر
ایک فضا پیدا کر رکھی تھی۔ کئی دلمنیں اس کے سامنے یوں کروں میں بند کی گئیں اور کئی دلمنوں کو اس نے
صیخ سویں کے سامنے، بجا تے اگلا بیٹھا۔ آنکھوں سے نظریں چلاتے دیکھا تھا۔ پھر جلا ہوا اور دل طربز کا
اردو کی غزویہ شاعری کا جس نے اس کے دامغ میں قند گھول رکھی تھی۔ وہ اس وقت بالکل اس جڑیاں کی طرح
بیٹھی تھی جو ناشتے کی میرے کچھ فناٹے پر بیٹھی یہ سوچتی تھے کہ اڑک کسی ہو کر پچھنچ بھر جیں۔ بھی اسیں جانے
اور میں پکڑی بھی نہ جاؤں۔ عجیب تھا کا خوف، ہمیں عدایہ چوری کا احساس، میکے کھر کی بھی بھی یاد، سسرال
والوں کا پُرپتاک خیرِ قدم، نئی زندگی سے ان گنت ذہنی والشیاں، گئے زمانے کے کئی طریقے کے الوداعی
وست پنجے۔ کیا کچھ تھا جو اس لئے رینگ رینگ کر اس پر سوار نہ ہو رہا تھا۔ کبھی وہ گھبرا کر غسلانے
کی جانب رکھتی جس میں نینے رنگ کا زیر دکا بلب روشن تھا اور کئی باروہ بڑے دروازے کی طرف
پُرماید نظر دل سے جانکھی بدھ رہے اس کے دلما کو آتا تھا۔

جب دلما اس جملہ عروضی میں داخل ہوا تو وہ اپنے خیالات کی رو میں دو ایک بار لمبا لمبا اونچھے
بھی کچھ تھی۔ رہیکان لپنے فٹو سے زیادہ خوش شکل اور دیس تھا۔ اس وقت زریں کی اپن اور چست
پا جائے میں وہ کچھ اچکا اچکا سانظر آتا تھا۔ لیکن ایک نظر میں مینا نے بھانپ لیا کہ دلما اس سے زیادہ
خوبصورت ہے۔

یہ اس کی ایسا کیلئے پہلا دھکا تھا۔
مینا ان لڑکیوں میں سے تھی جو بنی کراوڑھ کر چھین چھپت کر خوبصورت عورتوں میں شامل ہو
جایا کرتی ہیں۔ پکڑا، زیور اور میک اپ اس کی ذات پر فوب کھلتا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہ تھی
جو سو کر اٹھیں تو بے اختیار پیار کرنے کو جی چلے۔

رہیکان فر خاموشی سے گلے کے سارے ہاڑ کر سی پرڈ الدینیے اور بڑی سی جانی کے کھانا:

”یہ مشرقی شادیاں بڑی تھکا دیئے والی..... اور احمدیہ ہوتی ہیں۔ سب کچھ اتنا

اور SILLY ہوتا ہے۔ آپ نے ابھی تک بڑے تبدیل نہیں کئے۔“
ریکاں جو کچھ کہہ رہا تھا درست تھا جس طرح کہہ رہا تھا اس میں کوئی خرابی نہ تھی ہرف اس کی آواز میں
جو لا تعلقی، اکتابست اور برتری تھی اس سے معامینا کو خوف آگیا۔

دیکھنے کے لئے بھائی بند کر کے پھر اسی آواز میں کہا — “آپ یہ گھوڑے کا ساز سب آتا
ہیں اور کوئی ناٹیٹ سوت وغیرہ پہن لیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔ آمام دہ بابا۔“

غلمنا نے کادروازہ بند ہونے پر نیلے نگ کے بلب کی روشنی بھی بند ہو گئی۔

گرم گرم آنسو خدا جانے کماں کی قید سے نکل کر آنکھوں سے جھاگے۔

مینا نے کچھ عرضہ اکچھ نا امیدی، اکچھ عجیب قسم کی رنگ سے ایک ایک زیورت سے اندر کر انہی سے
میں تپانی پڑھیر کر دیا۔ سیلیوں نے اس کا میکہ بالوں کی بڑوں سے اتنے احتیاط سے ٹکایا تاکہ سے فوپ
کر علیحدہ کرنے میں اس کے ہیر شافعی کو بھی کافی نقصان پہنچا۔ انہی سے ہی میں اس نے اپنی نقلی
پلکیں اور گرفن پر بیٹھے ہوئے کا جھٹا انار کر رکھ دیا۔ سوت کسیں میں سے ناٹکوں
نکالا اور لے لیوں پہن لیا جیسے ابو کے کھنے پروہ دوائی پی لیا کرتی تھی۔

جب غدمان نے کادروازہ کھلا تو ریکاں ہرف پا جائے میں لوث تھا۔ چھاتی کے بال کندھوں کے
بالوں سے جا ملے تھے۔ سب کچھ خواب کی طرح بے حقیقت سا تو تھا لیکن اتنا خابصورت نہ تھا۔

”ریکاں نے ذیر دے کے بلب کی نیلی روشنی میں اسے گینٹ گرل کی THAT'S BETTER

طرح بیٹھے دیکھ کر کہا۔

”خدا جانے دلسوں کو اس قدر IDIOT طریقے پر سمجھنے کا گیا مطلب ہے..... آپ فیں

پنڈ کرتی ہیں کہ بند کر دوں.....“

لیکن ابھی میسا جواب بھی نہ دے سے پائی تھی کہ ریکاں نے نیکھے اس سوچ پنڈ کر دیا۔ نیلے نگ کی روشنی
میں اسے اپتا کرہ UNDER WORLD کی طرح نظر کرنے لگا۔

اس کے بعد جو کچھ بھی ہمارے زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ گے۔

رات بھر میں وہ جا گئے سوتے میں عجیب عجیب جھوٹ پر متعلق رہی۔ کبھی وہ خواب میں سوچتی ابھی وہ لشکر گی اور اسی اسے ناشرت کیلئے بداری ہوں گی۔ کبھی اسے لگتا کہ وہ مر جائی ہے۔ کسی ایسی جگہ کسی ایسی نار میں موجود ہے جس کے سامنے آتی پاٹا ہے۔ میرزاد سیر کا چینی چہونہ میں ملی ملبو جوڑے کی پیسی نے اس پر جھکتا ہی پہنچا، اور وہ نہ کرتی تھیجے، سچی جاتا۔

اب اسے گرم پانی میں با تکہ سالٹر ملا کر نہایا جا رہا ہے۔ اس کے بلکے ابھن کی خوشبو اٹھ رہی ہے تو لیہ سارا کوون میں دمکتا ہوا ہے۔ سیلیاں وہندی لگا رہی ہیں۔ کبھی کس ذرا سی میں جائے تو...
سے روپیں کر کے کیوں کیں آتے جا رہا ہے۔ ذرا سا پف جھوٹ جانے پر دودھ چارچار پر
اس کا حسن آئکتے اور بیتتے ہیں وہ اپنی سیلیوں کے جھوٹ میں کتنی اہم مسوس ہو رہی ہے۔ سبکی نظریں
اس پر کروکوز ہیں۔ سب کہہ بے میں — کتنا درپ چڑھا ہے مینا کو سب بنوں کو اس کا کتنی مینا۔
اس کے ساتھ ولے پینگ پر ریان اونڈھا سو رہا تھا۔ اس کی پشت پر بال اس طرح چھیدتھے
جیسے جعل نہیں کے نقشوں میں پیاروں کے نشان ہوتے ہیں۔ چدر سے چھدے لکھنوریں کی طرح نہالے
جنوب پھیلے ہوئے۔

مینا کئی بار سوئی۔ کئی بار جاگی۔ ہر بار جب اس کی آنکھ کھلتی ایک تمثیل باؤ امرخ و سفید چہرہ اس
پر جھکا ہوتا زیر یو کے نیلے بلب میں یہ خوبصورت شکل اسے ڈریکولا سی نظر آتی جو اس کی گردان سے لوٹو
چونے جھکی پلی آتی، جھکی چلی آتی۔

وہ خوف سے آنکھیں بند کر کے لپٹنے ناخن سنبل کے تنی میں سر کرتے ہے گزد دیتی۔ اس خوف سے وہ
تینکے کو رنجی کرتی رہتی کہ اگر اس کے ہاتھ ازاں ہوئے تو کہیں وہ اسی تمثیل تے چھر کو نہ کھڑھڈا لے۔ سالا
کرہ کی وینگ روپ کی طرح بند بند تھا۔ اسی ٹھنڈن میں صبح ہو گئی۔ دلماء کے گھال میں نے جسم کی نیچوں
پر نیڑھا دیتھے تھے۔ لیکن چھر سے پر ایک بو سے کا نشان بھی نہ تھا۔

مینا کئی بار پانی پیاں کیں بار بار سے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے اسے کھا دیا تو اس میں ریت
مل کر پلا دی ہو اور سامسے دانت کر کر اڑتے ہوں۔

اس رات میتابھیے گناہی گئی۔ کبھی بھتی گھر جا کر سب کچھ بتاؤں گی۔ پھر سوچتی آخوندکے نو
ہے کیا ہے کوئی کیا تھے گا؟ اتنی سوچ کو چوچی کہنے والی تو میں بھی نہ تھی۔ سب جاتی تھی کہ بالآخری کچھ
ماحصلہ ہے؟

لیکن پھر دل پوچھتا کہ بالآخر سے پہلے..... اور پہلے اور پہلے کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی
نظرود میں سارپنی پان گھومتے۔ کبھی جگرے نہکتے۔ پاپورش کے درمیں پر واٹک شوز پسنا سیہ باجی گھوم
رہی تھیں۔ زملے پر چپی ہوئی گلبابی کی تصویر نظرود کے سامنے گھومتی اور گھومتی پہلی جاتی۔ گھر جا کر کس جیز
کا لفڑ کرے؟

گھر جا کر ماں کے کندھے سے لگ کر کیا کہے؟

ماں کیسے مجھے گی..... بہنیں کب جان سکیں گی کہ مینا اس سوئی کی ماں نہ ہے جسے پچھے پڑی
پر کھو کر بھول جلتے ہیں اور جس پر سے منوں بھل ٹھیں چھکا چھک کر کے میلوں دوڑکل جاتی ہے۔
سرال میں لے کوئی ایسی تکلیف نہ تھی جسے وہ انگلیوں میں گین گین کر کہ سکتی۔ ایں
وو..... تین اس کا نسب کچھ مینا سکریں کی طرح تھا۔ ہر طرح کی خوبصورت خوش آئندہ پچھے
تصویریں بن رہی تھیں۔ مثہلہ ایک بھی تصویر، ایک بھی، ہیولا اس کو رے لٹھ کی سکریں میرے
جنبد ہو گئے مرتا تھا۔ سرال تو اس لٹھی جنکی کی ماں نہ تھی جسے پہنڈ تو وہ پہنڈ مے کردہ کمال سے چھتی
ہے پر انداو قر پاؤں من من کا ہو جائے۔

پھر اچانک شادی کے چندوں بعد مینا نے پکڑا زیور پہننا پھوڑ دیا۔ اس کے شوہر کو توبت خوشی
ہوئی پر ساس بہت تکملا ہیں۔ مینا میکے پتے کووار پتے کے پڑے اٹھا لائی تھی۔ اب وہ لٹھ کی شوار اور
چھنا ہوا چینک کا دوپٹہ اور طہری بڑی بھر سی، نامعلوم سی، اچھی کی روکی نظر آتی۔ وہ دل تیار نہ والیوں
میں سے نہ تھی۔ اوٹلگی سی، سستھی اور دلہ دیوں کا کام۔ مینا دوپٹہ اور طہری گھر میں اپنے طبقے کی ملادر مرتی۔
ایسی طازہ مدد حذر خرید بھی ہو۔

یوں گلگٹ کی طرح بد رنگ پڑی رستی پرانکھوں پر اس کا لبس نہیں تھا۔ کسی نکلنے میں یہ بجا کی پڑتے

والی ہلکی شربتی آنکھیں بڑی چکلی اور کٹاری کی تھیں۔ اب مینا کی زد حسی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ رو دو کر آنکھیں چھوٹی ہو کر اندر کو حضن گئی تھیں۔ کہاں تو وہ ایسے گھر سے آئی تھی جو ہر حال میں زندہ رہنے کا قائل تھا۔ کہاں اب وہ یہ سوچ سوچ کر نیم پاگل ہو گئی کہ صبر کر مینا۔ اچھے دن آئیں گے اور مزدراں بن گئے۔ کسی بھی کسی بھی اللہ کے خون سے سرم جاتی کہ کہیں یہ سبک فزانِ نعمت ہی میں شامل نہ ہو جائے پھر جب دل پر کوئی کوچاسا مارتا۔ راتوں کی تہماں پیاں دن کو یاد کیتیں تو دل پتی ہو کر بکھر جاتا۔ پسے پسل تو مینا اپنے شوہر کے سامنے دوچار تباہ یونہی بے ضبطی رو دی ریحان نے ہمیشہ بڑی ابخاری آواز میں ایک ہی بات کہی:

”تم بہت TOUCHY ہو۔ آخڑ پا کیا ہے؟“

— ریحان ان مردوں میں سے تھا جو عورت کو نافذ لعقل کمجھتے میں اور اسی لئے جب کبھی مورت رفت ہے تو اسے اس کی مزفری اور احتیٰق پن کمکھر کو تکلیف کی وجہ کبھی دریافت نہیں کرتے۔ ریحان کو منانے کا مرن ایک ہی طریقہ آتا تھا یعنی مینا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اپنے کمرے میں لے گئے اور اندر سے کندھی پر ٹھاکی۔ اس کی مردانگی ایک ایسی ووجہ تھی جو۔ شتر کی فصلیں، ہر مندر کا داد دار و ترے کا ہر دانہ۔ تکلے کی شرپناہ اپنے زور بازو سے کھولنے کی عادی ہو۔ ریحان کے نزدیک اُدی عورت اسی کے ساتھ مونے کے بعد نہ اس سے نہ دنیا سے ناراض رہ سکتی تھی۔ اس انتہا پر مورت کی صحت، خوشی اور فناخت کا اختصار تھا۔ وہ جسمانی رابطے کے تو سطھ سے مینا کو جان پایا تھا اور اس میں کے بعد وہ دونوں ایک ہی کمرے میں اجنبیوں کی طرح گھنٹوں بیٹھے رہ سکتے تھے۔ اس طرح کے منکر کے بعد وہ ہمیشہ یہی کرتا:

— اب تو دوچار دن تو نہیں رہتے گی۔ یہ اذ بات ہے کہ مینا کو اس کے بعد اور بھی طغیانی آئنے کے

کچھ عرصہ تو مینا کو اپنے آنٹوں پر اختیار نہ تھا پر جب لے ہر بار ایک ہی نیتجہ بیکتنا پڑتا تو وہ محظا ہو گئی۔ اب ریحان کی موجودگی میں وہ سورجی موجودی آنکھیں توئے پھر قرپا ہمروں سے کتنی کرتا نہ رہتی۔

مینا کی ساری ایک گھم کام کر نیوالی سادہ صورت سادہ سیرت بھوپلے نہیں تھی۔ اتنے ماڑنے زمانے میں ایسی تھی برتائی ساد تری سے گھر کے نام کام لکھتے تھے، اسی لئے اسے یہ نکلا۔ رہتی تھی کہ کہیں بوریگان سے مینا کی نہ بی۔ تو اچھا کام کرنے والا ایک فرد گھر سے کم ہو جائے گا۔ کچھ کچھ شک و شکہ تو اس کو پڑتا ہے اور ہستاخا پر نہ ہو منہ کھولتی تھی نہ ساس اتنی دل والی لکھی کہ بڑھ کر بھوکو گھوکے نگاہیتی۔

کبھی مینا کا اتراء ہوا ساچھہ دیکھ کر بیگان سے کہتی ہے: "کے کوئی فلم پر دکھالا۔ میر کلا اسے سارا دن کا ہول میں روکھا ہتھی ہے؟"

ہر بار میر سپلے کا بھی دہی نیچہ نکلتا جو رونے دھونے کا لکھا کرتا تھا اس نے مینا نے باہر جانا بھی پھوڑ دیا۔

جب پہلی بار بیگان نے اس پر کھجڑا چالا تو وہ لیے پکڑی گئی جیسے چکا مارا ہو اور اس کے پکھے ہو جاتے دہ غوب رو دھو کر سلنے سے نکلی تھی کہ گلیری میں ساس اور بیگان مل گئے۔ دہ دوپنی ایک سپیٹ سے پان چبار ہے تھے۔

ساس پیچ کر بولی: "بیگان اسے کہیں لے جا دیکھ تو کسی اداس ہو رہی ہے۔"

بیگان خدا جانے کیسا بھرا بیٹھا تھا، پھٹ پٹا اس کی اداکی دد دکرنا میرے بس کی تباہ نہیں۔ خدا جانے کیں یا اون کو یاد کرتی تھی ہے سارا دن۔ اس کا طل شروع دن سے مجھ سے نہیں ملا اماں بھی — استھوہ بربخت اپنی بیانی بھروسے پیاریکی ہے۔ اسے کبھی سوت کیں میں کبھی دراز میں سنبھالتی پھرتی ہے۔ میرا سے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ زندہ ہوں کر مر گی۔"

بیگان تو یہ کہ کر جلا گیا پکن دنیا اس کی نظر میں فیڈ آڈٹ ہو گئی۔ وہ جو زندہ گی اور موت کے درمیان ہوئی تھی تھی۔ اس کا صدیق تھا کہ جہاں سیشیتی بیگان کی بات اپنی کی طرح کچھ سے دل میں اتر جاتی۔ کابینکی سیلیاں آنسو ڈرکت بیوں میں ٹوٹ ٹوٹ کر بنتیں۔

”یہ ہنی مبلد ہے۔ دیوانہ بول بلے گا وہ..... دیوانہ۔“

”ہماری مینا تو شرزاد ہے۔ ایک سے ایک کھانی سنائیں گی دیکھاں کو۔“

”اس کی باتیں تو مصری کی ڈیاں ہیں۔ برفی کی تکڑی ہے ہماری میٹا..... برفی کی تکڑی۔“

”دیکھان گئے جب بھی ہے پسپنی، چھینا۔ پسپنی کے عالم میں پسپنی۔ ان کے درمیان آتش باڑی کا نشانہ ہوتا اور بعد میں گھپا اندھیرا چا جاتا۔ دیکھان کے ذمہ کے مامنے اتنے دبیز پر مے ۴ تھے سنگین پرے۔ آتھ رکا و شیش تین کم مینا آگے بڑھتی اور پھر منجد ہو کر رہ جاتی ہے دوادھی جو ایک دوسرے کی بولی شہ جانتے ہوں اور لبے صفر پر ایک دوسرے کے ساتھ ہو لیں۔ وہ بھی اسی لاعلمتی سے ایک دوسرے کے ساتھ چلتے رہے۔“

”اس دانقہ کے بعد ساس صاحبہ نے اپنا بخشتی زیور کھولا۔“

”ساس کی ہاتھ قائم بھوئی اہمیں کٹھوئے ناخن جیسا بے وقت سمجھتی تھیں۔ مینا کو مجھ نے اونچل کھانے کے موقع نہیں تھے تو اپنی اہمیت ہے بوكھلا اٹھیں۔ جاندی خدا کے فنسے سے جہازہ جانزو ہونے تک بخشت میں کریمث کارڈ کے طور پر استعمال کرنے سے لیکر سوسائٹی میں دینے کے طور پر دکانے کے تھا فاماً فاماً تفصیل طوز پر اسے سمجھائے ہر بیلت کے انجام میں نہیں یہی کہتی۔“

”میں اماں جی کوئی شکایت کرنی ہوں کر آپ مجھے سمجھا رہی ہیں۔“

”نہ بیٹھی بیرے چرس سے ملتبے کہ تو خوش نیں۔ بیٹا۔ شوہر کی ایک خوشی سے مترواب ملتے ہیں۔“

”اس حساب سے وہ بے حساب ثواب کمل جکی تھی۔“

”اپکو وہ ہم بے جی میری طبیعت ہی اسکا ہے۔“

”ساس اور بھی علسانار پیاری اندرونی ہو کر کتھی عمر قول کو ہزار شوق ہوتے ہیں۔ تو بر دفتر سے آئیو الہ ہو تو لا کھناؤ مسکھا رہتا ہے۔ دل میں ایک دلہو ہوتا ہے ایک شوق۔“

”بس بھی۔ مجھے شروع ہی سے ایسی باقیں کاشوق نہیں تھا۔“

جب سارے کو نیچی ہو گیا کہ بُو کو ایسی باقاعدہ شوق نہیں ہے تو اب وہ پکے دل سے اپنے بیٹے پر ترس کھلانے لگی۔ جب بُو ہی صوفی بُرف کا توہہ ہو تو بے چالہ صحت مذرا کا کیا کرے۔ اب وہ باہر گئے جانے والی سے یہی کہتیں :

”ہمیں تو فرشتہ لگا ہے خدا قسم نہ کسی کے تین میں مذیرہ میں پر کیا کریں مرد تو فرشتوں کے ساتھ نہیں رہ سکتے ان۔ اس کے تو وجد بی عورت فری جیسے نہیں ہیں۔ اسے کچھ خیال ہی نہیں مرد چلے ہے باہر کئے کھا آئے۔ چکی بیٹھے دھکی یہ قو...“

کچھ سالوں کے بعد جب کوئی سخا منا کی گھر ز آیا اور دیکان گھر کے بھائی میں متقل طور پر باہر کئے کھانے لگا تو سارے نیتاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”خدای قسم الگرمی بات سے تیرا دل ٹوٹا ہو تو مرات صاف مجھے بتا دیتے تو وہی ہے انسان نہیں، اور تیرا دل میں دکھانا نہیں چاہتی۔ بہت باتیں سنی ہیں میں نے ریحان کے متعلق۔ اگر تو اجازت دے تو اس کا بیاہ کر دیں کیمیں۔ کم از کم شام کو تو گھروپس آجایا کے گا قیری ہر بانی سے ریحان پیغ سکتا ہے تو میتلنے دشوار پیجا یا نہ سہا ہے تو گھر جانے کی دھمکی دیا نہ پانے پر ترس کھایا اور چبپ چاپ دوسری شادی کی اجازت دیدی۔“

شادی کی رات نیتاں پر عجیب گز رہی۔

وہ کبھی سوتیاڑاہ میں جل کر سوچتی..... آب بی بی! اُن بھی اس آگ کا مزو پچھا دیکھ تو اس بیٹھی کی اگ کیکا ہے۔

چون گھر جاتی اور سوچتی..... اُلی گھر چلی جاؤں گی جمیں میتھے بھر بھی ایک بُن کے گھر پوتو جا رہیں تو یہ پار پوچھ گئے.....

پیر خیال آتا چسک مجھے دیکان کو مبارکباد دینی چاہئے کہ نہیں۔

کبھی کبھی اپنی شادی کی رات ذہن میں گھرنے لگتی۔ لکھا سرخ و سپید رنگ تھا ریحان کا۔ لکھا اونچا قد۔ اس کی پیٹھ پر بال اس طرح تھے جیسے نقش پر کوہ لیدال کے نشان۔

کسی بھی کچھ یاد آتا بھی کچھ۔ اسی سوچ کی مردیں جب آدمی رات سے جا ملیں تو وہ اپنے کمرے سے
نکلی اور دلمن والے کمرے کے پھراؤے چلی گئی۔
کھڑکی بندھی بیکن اندر کی بھری سے صاف نظر آ رہا تھا۔
بھی روشنی تھی۔

نمی دلمن سارے گئے پاتے پینے پنگ کی پشت سے جھے ہوئے گاہ میکے پر کھنچا جائے دا جہن
کی طرح بیٹھی تھی اور ہولے ہولے سانش لے رہی تھی۔

ریحان کا تین چوتھائی حصہ اس سے چپا ہوا تھا میکن پھرے کی ایک چانک اور اداز مان آ رہی
تھی۔ کتنے خوبصورت ہاتھ میں تمہارے۔ یہ مندی کرنے کا ہے اتنی محبت سے؟ جی چاہتا
ہے تمہارے ہاتھ کجا جاؤں کے؟

تجھے تو ایسی باتوں کا شرق ہی نہیں۔ بس سیلیوں نے مجبور کر کے رکاوی۔ میں ذرا یہ میکہ آتا رد،
ریحان نے جلدی سے نمی دلمن کا ہاتھ پکڑ کر رہا۔ رگارہنے دو۔ کتنا اچھا لگتا ہے تمہارے

ماستھ پن.....

”خدا قسم گردن تھک گئی ہے میری۔ کم از کم یہ گلو نند قاتار دوں میں؟“

”میری خاطر گاہ کی رات مجھے اسی طرح نظر آؤ۔ میں اپنی دلمن کو زمیں میں غفوظ کر لینا چاہتا
ہوں تاکہ جب میں بوڑھا ہو جاؤں اور تمہارے بالوں میں سفیدی آ جائے تو۔ میں آنکھیں بند
کر کے ہمیشہ اپنی دلمن کو دیکھوں ایسی ہی سمجھی ہوئی گھر یا سی دلمن“

راجہ ہنس محبت، چاؤ اور تعریف کے پانیوں پر تیرہ ہاتھا — اور ریحان اپنے اور چلت
پا جائے میں بہوس اپنے گلے سے ہارا تار اندر کا اس کے زانو پر رکھ رہا تھا۔

دلمن کے کمرے کی بقیہ بھی گل نہ ہوئی اور زیر دکے بدبک نیلی روشنی مسلکا نے کی دلیز
چھوٹ کر ایک بار بھی اندر نہ آ سکی۔ دلمن ساری رات زیور پینے بیٹھی رہی اور ریحان اس سے پیار بھری
باتیں کرتا رہا۔

صحیح جب یہی پہلی دھوپ منڈریوں پر آئی اور ایک مینا چپ چاپ چھاٹک پر بیٹھ گئی کریز کرنے
گئی تو مینا کی ساس براہم کے میں سیدہ کو طبق ہوئے آئی اور اونچے اونچے بین کرتی ہوئی بولی:
”لمئے میری بھول ہو۔ ہائے میری سادہ ہو..... میں تو کجھ تھی کہ اس کا دل، یہ عورتوں جیسا نہیں
ہے..... لمئے میری مینا مر گئی..... ہائے سوتیاڑاہ میں جل گئی میری مینا..... ہائے میری الٹی
مُت۔ میں کجھ تی رہی اسے ایسی باقاعدہ کا شوق ہی نہیں ہے۔ لمئے میری مینا..... ہائے میری سیدھی ہو۔
ہائے میں تو کجھ تھی وہ مرد کے ملائے سے جا گئی ہے.....“

صرف سینیگ پلڈ کار سوسنہ والی مینا کی انکھیں اس طرح کھلی تھیں جیسے وہ اب بھی کوئی خواب
دیکھ رہی ہو۔ گجرے، سانچی پان لور تصوریوں سے لے جو انخواب جس میں ایک بھی لمسہ نہ تھا اور چاروں رفت
رو سے ہی بو سے بکھرے تھے۔ اس خواب کی خر غذا جانے چھاٹک نہ کپونکر پہنچی کہ چھاٹک پر سیٹھی مینا
نے ایک بار سراج چایا۔ زور زور سے چینی اور پھر زور زور سے پنجے بجاڑتی ہوا میں پلٹر پھڑاتی اڑ گئی۔



سچھوتہ

لائیں ناٹک عبد الکریم بڑا مفرج آئی تھا۔ بڑی دیر میں روٹھنے والا اور بہت جلدی من جائے والا۔ میں بات کو ریف ناٹ رنگا کروہ بڑی تیسوی سے منصر کر دیا کرتا۔ اس کی آنکھیں کسی بچے کی آنکھیں تھیں۔ اُجھی اُجلی و حلی و حلالی اور پُر اعتماد۔ عبد الکریم سے لئے کے بعد کسی اور سے ملنے کی تناول میں باقی نہ رہتی کیونکہ وہ بہت کم سوال پوچھتا اور اس سے بچا کم اپنے متعلق باتیں کرتا۔ وہ زنوگوں کے انتشار کر دیتے کا عادی تھا۔ اپنے اندر کے لاواکی چنگالیاں باہر پھینک کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر زندگی ایسے گزرتی جیسے چپ چاپ بنی رنگائے ندی کے کنارے مچھلیاں پکٹنے والے کا گروہ بیٹھا ہوا زندگی کے دریا سے بڑی فضیلی پکڑ لی تو بھی خوش اور بنی خانی نکل آئی تو بھی خوشی کا تعاقب عبد الکریم کے ساتھ بڑا گہرا تھا۔ خوشی، خوش خلقی، خوش وقتی اس کی عادت تھی۔ اس کا پہناوا تھی۔ اس کا اور ڈھننا بچھونا تھی۔

اسی نئے جب الاباد کیمپ میں رات کے تین بجے بیٹھیست ہر بُنی کھنڈ تین سکھ سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا تو اس وقت بھی عبد الکریم مسکرا رہا تھا۔ رات کے تین بجے از مرغ زدای شروع ہو گئی۔ ابھی پونے گیارہ بجے وہ تلاشی سے فارغ ہونے تھے۔ اب ایکبار پھر وہی مسلسلہ شروع ہوا اور سپاہیوں نے اپنی جیسیں مرے ہوئے کوئں کی جیبوں کی طرح باہر رکانی شروع کیں تو سب کے چہروں پر خونوار بھیڑیوں کی درندگی امنٹنے لگی لیکن عبد الکریم مسکرا تاہماں اٹافٹ اٹھا۔ بیٹھیست کو

سروٹ کیا۔ پھر اپنے تکمیل کو اٹھا کر چند سنتے، دو سگر میں اور ایک میلا سا بچوں کو لکیر دار چیتھڑا اٹھایا۔
”دوفوں ہتھیڈیاں کھولو۔“ سپاہی نے اس کے کندھے کوبٹ سے پھکر کر کہا۔

عبدالکریم نے اپنی دونوں ہتھیڈیاں کھول دیں۔

”یہ چیتھڑا کیوں رکھا ہے تم نے سرانے تکے۔“

”کونسا چیتھڑا؟۔“

”یہ اندھے۔ یہ جو تمارے ہاتھیں ہے۔“

”یہ تو دوال ہے ہمارا۔“ جملی بجی میں عبدالکریم بولا۔ ”ادھر چوڑا گا چھاپ ہماری۔“

ایک بچالی بننے دیا تھا عم کو؛

ہر بنس آگے بڑھا۔ وہ بڑا ہی کم عمر نیشنیٹ تھا۔ اس نئے اس میں بوجھی نفرت تھی خالص

ٹرینیگ ک وجہ سے تھی:

”تم مسلوں کی غیرت کو کیا ہوا۔ چوڑا گا بچا کانا۔ یعنے شرم نہیں آتی۔ سپاہی جس میدان

سے مفروہ رہتا ہے جہاں شکست ملتی ہے اس جگہ کا نام کبھی نہیں لیتا۔“

عبدالکریم مسکرا تارہ۔ وقت پر۔ ہر بنس پر۔ لپٹنے آپ پر!

”میں جانتا ہوں اس بدن کے ساتھ تم نے کیا کیا ہو گا۔ ختنے شدہ گنوں کی کوئی بنس نہیں ہوتی۔“

کوئی ماں نہیں ہوتی، کوئی بیٹی نہیں ہوتی۔ ان کا دنیا کی ساری سورتوں سے لبس ایک رشتہ ہو گئے

..... زنا کا رشتہ!“

عبدالکریم پھٹے کی طرح سخت ہو گیا۔ اس کی ریڑھ کی بڑی، اس کے بازوؤں کی بڑیاں، اسکی

مانگوں کی بڑیاں، اسپر پھٹے ہوئے گھوڑے کی طرح ایسوں گنگیں۔

پہلی بار عبدالکریم کے چہرے سے مکلاہٹ غائب ہو گئی۔

جب وہ اگہہ بارڈ سے کچھ دور ہماری لمبی تور میساں کچھ درکیٹے بند ہو گیا۔ سلنے میرے

دیس کی عافیت تھی۔ جھنڈیوں سے لداہوا پچاہ تھا۔ میرے ملک کے نئے۔ اپنے لوگ آہستہ آہستہ

چستہ ہونے لگا میں جو کائے ہم دور دی یہ سرخ قالینوں تک پہنچے۔ ان قالینوں پر سے چل کر میں اس شامیل نے تک جانا تھا جس کے لاؤ مہبیکہوں کی آواز آرہی تھی۔

سب قیدی سرخ قالین پراکٹس قدموں سے لپٹنے اپنے قرآن کریم کندھوں سے لٹکتے ہوئے ہوئے پل رہے تھے۔ وقت اونماں سے طے ہو چکے تھے۔ ہر طرف ہمارے ہوئے لوگوں کیلئے بیت جانیوالوں کا ساسوائٹ تھا۔ فضا میں ترس کی آہیں کوئی بھی تھیں۔ میں نے سرخ قالین سے پچکر چلتا چاہا کیونکہ میں قیدی تھا۔ قیدی رہا تھا اور قیدی بھی سرخ قالین پر نہیں چل سکتا۔ وہ سرخ قالین سے ارنے بھینے کی طرح پڑتا ہے۔

شروع لے پڑے شوق نظروں سے ہمیں دیکھو بستے تھے جی کی کوئی دہن دیکھنی بروادیں یوں نکالیں آگے بڑھا رہا تھا گویا میں پیدا نشی نامرد ہوں اور ان مشاں نظروں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی قید نے مجھے کوئی نفعان نہیں پہنچایا تھا۔ صرف مجھے خصی کر کے پھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کا اساس سرخ قالین کو دیکھ کر ہوا — میں ذہنی طور پر، جسمانی طور پر، اخلاقی طور پر مذہبی طور پر اہر طرح سے نامود ہو چکا تھا اور میرے لئے میرے شر کے لوگوں نے سرخ قالین پچھا رکھتے تھے۔ اونچے اونچے گیٹ، سرخ بزر جنگلیاں، سیلوٹ، بغل بیڑیاں، بولسے..... دعائیں یہ سب کیا تھا؟ — کیوں تھا؟ — یہ سرخ قالین کس کے لئے پھاتھا؟ — کس لئے؟ —

م قید اس وقت مژروع نہیں ہوتی جب ساہی اپنے ہستیاں آتا کر دشمن سے سمجھوتہ کر لیتا ہے بلکہ بے لینی کا دلمکھ اسے قیدی بناتا ہے جب پہلی بار اسے اپنے زور بازو پر اعتماد نہیں رہتا۔ اور دشمن کی قوت کا اندازہ لگا کر اس سے پڑکتا ہے۔ مجھے وہ دوناں جگہی طرح یاد ہے جب میں قید ہوا تھا۔

میں اس وقت دنیا بچ پوری میں تھا۔ رات بھر گھسان کی جگہ ہی تھی۔ پوچھنے ہی دشمن کے تو ہواں جہاندہ نے ہم پر مسلسل نمبراری کی تھی۔ فضا میں گوشت جلنے کی خوشبو تھی۔ نئے جملے سے

پسلے بڑی جاندار خاموشی تھی۔ ہر جگہ سے پسلے، ہر روفاری سے پسلے، ہر انسانی رشتہ دُنے سے
پسلے ایسی ہی خاموشی ہو اکرتی ہے۔ عبدالکریم میرے پاس طریقے میں پیغمباڑ سے اطمینان سے اپنے
چاقو سے غلیل بندا تھا۔

ALL PURPOSE

”عبدالکریم!“

”جی سر!“

”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں سر۔“

”یہ لکڑی سی تمارے ہاتھ میں کیا ہے؟“

”کچھ نہیں سر۔ غلیل ہے؛ وہ منکرا کر بولا۔“ سندھی لکڑی سے بنائی ہے سر۔
میں چیپ ہو گیا۔ ہماری تربیت ہی ایسی تھی کہ میروت سے دو قدم ادھر ہو کر بھی عبدالکریم
سے بے تکلف نہیں ہو سکتا تھا۔

”یہے دل میں ڈھن کے ہوا جہازوں کی گھن گرجتی۔“

”میرے کافوں میں ماں ک شام کے پیا اگتھے۔“

”میرے وہود میں گھر کی یاد گندی نالی کی طرح ریگ رہی تھی۔“

ہر قیمت پر میں سب کچھ پچھڑ جھاڑ کر بھاگ جانا پا سنا تھا۔ یہ سارا قتل و فارت، یہ لوکی پیا
دھرتی ابنگالی لوکی، مغربی پاکستان کے لوکی، ہندوستانی پاہی کے لوکی پیاسی سر زدیں۔ یہ مشی،
شپلا کے پھول، سندھی کے درخت، انس کے پودے، کرش چوڑا کے ننگوٹے اگا، بھول بیٹھی تھی
بیوال بورڈھی گلگا پہ بینے والی بیک رو نو کا سے اب گلنے کی اواز نہیں آتی تھی۔ اب ہظرف کم چھوٹتے
تھے۔ ہر ای جہازوں کی سو پر سونک جیجنیں تھیں۔ کالی اتانا کا ناچ تھا! لوکا ناچ۔ موت کا ناچ۔ بیرجمی،
فلک کا ناچ۔

لوکی پیاسی کالی اتانا، سرخ زبان نکالے کھجتوں کو جلس رہی تھی بنا ریل اور تاروں کے درخت منہ کے

بل گرہے تھے، کنیا نبیں اس کے سر پر سے بن باپوں کئے، سوکھے مردا جنمیں میں پرداں چڑھا رہی تھیں۔ بوڑھی میں ہیں بھرے ہاتھ نے نوجوان میڈل کا اتم کر رہی تھیں جملہ کے نوجوان ناریل اور تاد کے درختوں کی طرح گرہے تھے۔ کئی ہوٹی نانگوں والے سپاہی زخموں سے چور دلن سے دُور ان ووگوں کو بچانے کیلئے لئے بیٹھے تھے جو اندر ہی اندر پہنچئے ہوتے دودھ کی طلن ان سے الگ ہو چکے تھے کالی ماہا کا سراپ روپ دور دور پھیلا تھا۔

ابھی کل ہمک جو جاتی جائی تھے اب دشمن تھے۔ ابھی کل ہمک جو ہم وطن تھے ہم مذہب تھے اب

کیا تھے؟

میں نے ڈرتے ڈرتے عبد الکریم کی طرف دیکھا اور آہستہ سے تیدی ہونے سے پہلے ایک سوال کیا۔

”عبد الکریم۔ تھا را کیا خیال ہے ہم جیت جائیں گے۔“

جیتنے کا سوال نہیں ہے مر۔ سوال اس بات کا ہے کہ ہمارا جاتی ہم کو بچاؤ نے یہ جان لے کر ہم دشمن کی طرح اس کے ایمان کو پامال کرنے والا نہیں ہے۔“
”بچالی ہندوستانیوں کے دوست ہیں۔“

”ہونے دسر ہم ان کے جاتی! دوست اچھا شرستہ ہے لیکن جاتی اپنا ہو ہے۔ وہ مکرانے

لگا۔!

”جیے عبد الکریم پر رشک آرہا تھا کیونکہ میری آزادی کے آخری لمحے تھے میں شکوک و شہادت کی صلیب پر پڑھا ہوا ہاتھ پاؤں ارہا تھا۔“

”عبد الکریم۔“

”جی مر!“

”دشمن کی ہوائی طاقت بہت بے۔“

”اللہ کی طاقت اس سے بھی زیادہ ہے مر!“

”انک شاہ چاہتا ہے۔ پاہتا ہے کہ تم سختیار ڈال دیں۔“

عبدالکریم نے لمحہ بھر کو میری جانب دیکھا۔ شاید اس وقت وہ کوئی گالی دینا چاہتا تھا۔

”سر، اس کا دھکا کامٹ کھاؤ۔ میدان یا معاف کرتا ہے یا بدلم لیتے ہے...“ تیر صورت

کرنی نہیں۔

اس وقت ہوا تھا جعلے کا سائز بجا۔

عبدالکریم اپنی پوست پر جنم گیا۔

لیکن میں نے سختیار ڈال دیئے اور تیری مورت قبول کر لی۔

میں ہندو فوج سے رُستا تھا۔ بکھی باہنی سے رُستا تھا لیکن کامل مانا کے صراپ سے نہیں

بچ کستا تھا۔ میں بڑی حیر عبدالکریم کے ممتاز ہوئے چہرے کو دیکھا رہا۔ اس کے چہرے پر قیدیانیں
کے کوئی آثار نہیں تھے۔

باکل اسی طرح میں درینک اپنی اس ورزی کو دیکھتا رہتا ہوں جن پر کوئی بونی ملیں بنی تھیں۔

یہ سیاہ رنگ کے کراس جن میں ادھار سوتیکا اور آدھی صلبیب موجود ہے۔ اس سیاہ نہر کے دونوں جان

پی ڈبلیو کھلاہے۔ ہماری دردیوں کو بڑی خوشی کے ساتھ دشمن نے داغا تھا تاکہ وہ ہمیں تباہ کر دو

ہم پر کس حد تک قابل ہوئے؟ مجھے اس مرتبے اس کا لے کر اس نے اسی آدھے سوتیکا نے مصلوٰۃ

کیا اور میری مردی مجھ سے چھین لی۔ میرے اندر کی دھلی دھلانی سفید شخصیت پر جا بجا غلامی کا سیاہ نٹا

پڑ گیا۔

پی فار پیک۔

ڈبلیو فار وار۔

جنگ اور امن ... ایک کا لے کر اس پر ساتھ بنے ہیں۔ یہ ہر جگہ ساتھ ساتھ ہیں ...

ہر جگہ امن کے دل میں جنگ کی گھری بجھی رہتی ہے۔

پی فار پینڈ فر ز۔

ڈبلیو فار داٹ ۹

پرند نر ز آف دار۔

پرند نر ز آن داٹ۔

انسان کیا ہے — جنگل میں بھی قیدی — امن میں بھی قیدی — کبھی کامے کتید
کبھی گورے کی — کبھی ملیس کی قید — کبھی خدا کی!

میرے پنگ کے سامنے ۱۹۰۳ء کا کالینڈر پھر پیدا رہا ہے۔

۱۸۰۴ء سے لیکر اس کیئنڈ راتک پچھا ایسا فاصد نہیں ہے لیکن یوں لگتا ہے جیسے ان سالوں میں کئی صد یا لہویت گئیں۔ کئی مذاہب آگئے۔ کئی تو میں مٹ گئیں۔ کئی نئے جزو پر پیدا ہو گئے۔ براعلم فکر سے بہتر ہو گئے۔ دریاؤں کے وغیرہ مدد گئے۔ پھر اپنی جگہ سے ریاگ کر کیں اور جبا
کھڑے ہوئے۔

انسان بھی کس قدر سخت جان ہے، کتنا کچھ سہ جاتا ہے۔ کتنا کچھ برواداشت کر لیتا ہے۔
سالوں میں صدیاں ہٹتا ہے اور صدیوں میں ایک اپنے آگے نہیں بڑھتا۔ حرف اس جان کے اندر کی
ہری بھری شاخ کے ساتھ ان گنت مردہ پتیاں لشکری رہ جاتی ہیں۔ یہ خشک پتے ہر سمحوتے ہر برداشت
ہر غصہ کے بعد اس کی ہری شاخوں سے پیٹے رہتے ہیں اور کوئی خدا، انہیں اڑاکنہ نہیں لے جاتی۔ بزر
شاخ کے مردہ اسخادر ساری عمر اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

یہ گو فرش پرٹا کی اور ہی ہے۔ میرے ڈھاکر جانے سے پہلے بھی وہ اسی طرح انہانے جی سے
صفافی کیا رکھتی تھی اس کی زندگی فرش دھونے، نماکی پھیرنے، فلش صاف کرنے، نالیاں اجلانے
میں گز دیکھے۔ وہ تم لوگوں کا اتنا میل کاٹ چکی ہے کہاب فرقہ ملامتیہ کی طرح اس کی وجہ آئینے کی
طرح شفات ہو کر بڑے لشکار سے انتقال ہے۔

یہ تجوہ کے دو بیٹھے تھے۔ بڑا بیٹا بڑا فراخ مدل اور ان چھوڑ قسم کا تھا جب وہ سڑائی سے نکلا
تو اس کے سیند پکڑے اور بڑی بڑی موچھیں دیکھ کر کسی کو بھی خبہ نہ ہوتا کہ وہ یہ تو عیسائی کا بیٹا ہے۔

اور کارپوریشن کی گندگاڑی پر سامنے شہر کا کوڑا دھونے جاتا ہے۔

جب تجوہ کے بیٹھے نہ اپنے گھر سے دُور اپنے احولے سے پے اپنا نام مذہب اتہ پتہ تبدیل کر کے ماچھیں کی ایک لڑکی سے عشق کر دیا تو اسی اسیزی کے باعث اسے ایک سورود پے کوئے مزدورت پڑ گئی۔ وہ صرف یہ رقم لینے آئے گھر ایسا تجوہ کو گھر میں ملکی پھیرنے، غلش دھونے سے کہا فرضت تھی کہ وہ گلزار میک پر پرسے بٹھالی۔ نذر بزری فروش سے ایک روز سورود پے ادھار لیکر دہ واپس چلا گیا۔ پورے چلسال بعد واپس وہا تو اس بار کارپوریشن کا اصلی جو ہڑا لگ رہا تھا۔ تجوہ نے گلزار کے بال پکڑ کر پہلے تو دوچار سیدھے ہاتھ کی ماری۔ پھر بلکہ کرنہ سر جو گما منہ ہاتھ دھلا یا اور صاف پچھتے کھو رہے میں ہمارے گھوکی تھی پہنچی۔ پھر گلزار اور تجوہ بڑی دیر تک آئنے سامنے بیٹھے رہے۔ گلزار کے منہ پر جندے سے پڑے تھے۔

”اڑ گیا چندری ماچھن کا شوق! میں نے تجوہ نہیں بتایا کہ یہ اوپنی جاتی والے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ پہتیرا تو مجی چاہتے ہے کہ اپنی بلاوری سے اڈ کر کسی اوس سے جلتے۔ مل گیا تو ماچھیوں سے۔ ملا بیانوں نے تجوہ اپنے ساتھ“
”نہیں؟“

”وہ نذر بزری جان کو الگ روتا ہے۔ میں بھلا کوٹا کوڑا کرنے والی سوروبیسے کہاں سے لا دوں؟“

”دو سے دوں گا سورو پیر بھی۔“
”چار سال بعد ماچھن نے دھکا دے کر نکال دیا مان۔“ ”تجوہ بار بار دہی قصہ دہرا رہی ہے۔ اپنے پی کے دھنکار سے جانے کا لے اتنا بُخ تھا کہ اس کی جدائی کا سارا روگ بھی کے سامنے ابڑی کی نظر آتا تھا۔

”مجھے دکھے دے کر کوئی نہیں نکال سکتا۔ میں خود آیا ہوں اپنی رفتی سے۔“
”اُن۔ اپنی رفتی سے۔ اسے پتہ چل گیا ہو گا تو ذات کا سیساٹی ہے، پیٹے کا جو ہڑا۔“

گلزار نے نظر میں بھکا لیں۔ وہ بڑی دیر تک اپنی دامیں ہو سچھ کا ایک کونڈا دانتوں میں لے کر کچھ سوچتا رہا پھر بڑی سخیف آواز میں بولا:

ماں۔ پتہ چل گیا تھا۔

اب تجوہ کے اندر خوشی کا فوارہ پھرٹ بھا جیسے آن دیکھی بھوکے خلاف ورث میں وہ کیسیں جیت گئی ہو۔ جھٹکھزاری کر میں دھمکا ادا کر دوں؛ ”دیکھا۔ دیکھا۔ زنانی کے تیچھے ماں کو چھوڑ گیا تھا۔ دیکھا کیسے دھکے اور نکلا اس نے۔“

”میں تجھے بار بار تبارا ہوں اس نے مجھے نہیں نکلا۔ میں خرد آیا ہوں پر تو سنے بھی۔“

ایسے بار بھینٹک کی سہقی کی طرح تجوہ کا دجور لٹک گیا۔

پچھے کچھ بنا دے تو مان بنوں میں۔“

بڑی دیر کے بعد گلزار نے ایک سکی بھری؛ ”اچھی بیلی گزر رہی تھی ماں..... چار سال گز کرے..... سادھی کی گز رہی کتنی ہے۔ چالیس برس اور گزر جاتے..... پر۔“

”پر۔۔۔ پر کیا؟“

”وہ فیصل پلانگ والوں سے چھلانے آئی تھی۔ میں چار سال یہی سمجھتا رہا کہ اسے بچے کا شوق نہیں میرا ہی شوق ہے بس۔۔۔ پچھلی جھوڑت کو.....“

گلزار کی آنکھوں میں بڑے بڑے آنسو گرنے کو پیار کھڑے تھے۔

”وہ اپنی بہن کا بچہ نہ لاد رہی تھی۔ مجھے بھوک گئی تھی۔ میں نے اسے دو جار بار بلایا۔ رشیدہ گئی میں نے غصے سے کہا: ”اتا شوق ہے بچے کا تو اپنا بنالے۔۔۔۔۔ کوئی ایک گھر دی ہوتی ہے ماں جب مرد اور زنانی کئی سال منے ہو جاتے میں۔۔۔ اعلیٰ روپ میں۔۔۔ وہ کہتے گئی۔۔۔ اب جو میں ساروں کی باقیتی میں پہنچوں۔۔۔ اس بے داش کو کیوں باقیتی پڑیں جگ کی میں اپنے بچے کا لئے دکھ کیوں دوں۔۔۔ مجھے اس سے اتنا پیار ہے۔۔۔ اتنا پیار ہے کہ.....“

تجوہ کا سارا دجور برف کی آندھنہ پڑ گیا۔